هدایت القرآن (۱۴)

مولانا محمد تقی امینی

ہدایت کے بارے میں قوم بنی اسرائیل سے خطاب

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ..... الخ

اے بنی اسرائیل[1]! میرے انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کئے[2] اور تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو[3] اور کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے اتاری وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور تم سب سے پہلے اس کے انکار کرنے والے نہ ہو[4] اور اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو اور مجھ ہی سے ڈرو اور سچ میں جھوٹ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ[5] اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو[6] کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہوتے[7]۔ اور صبر کرنے و نماز ادا کرنے سے مدد لیا کرو بے شک نماز مشکل ہے مگر ان لوگوں پر جن کے دل اللہ کے حضور جھکے ہوتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ضرور ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے[8]

❁

[1] ابتدائی ہدایتوں کے بعد حسب وعدہ تفصیلی ہدایتوں کا سلسلہ جاری رہا جس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اب ہدایت کے بارے میں قوم بنی اسرائیل سے خطاب کیا جا رہا ہے جس کی ضرورت خاص طور سے اس وقت ہوتی ہے۔ جب قوم میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے قوم بنی اسرائیل کو اس لئے چنا گیا کہ وہ اللہ کی فرمانبرداری و نافرمانی اور ترقی و تنزلی کی پوری داستان اپنے اندر سمیٹے ہوئی تھی اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں اہل علم مانی جاتی تھی اور بحیثیت قوم اس کو سرداری حاصل تھی۔ بنی اسرائیل سے مراد اس جگہ یہودی ہیں اِسر کے معنی بندہ اور ایل کے معنی

عبرانی زبان میں اللہ کے ہیں۔ اس طرح اسرائیل کے معنی عبداللہ ہیں جو حضرت یعقوب
علیہ السلام کا لقب تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام (یہ حضرت
ہاجرہ کے بطن سے تھے) سے جو نسل چلی وہ بنی اسمٰعیل کہلائی۔ اس طرح حضرت اسحاق علیہ السلام
(یہ حضرت سارہ کے بطن سے تھے) کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام سے جو نسل چلی بنی اسرائیل
کہلائی۔ ان دونوں کی اولاد کا یہ لقب مذہبی نہیں ہے بلکہ خاندانی و قومی ہے۔ بنی اسرائیل
سے یہ خطاب بظاہر انہیں کے لئے خاص ہے لیکن قرآن حکیم کا پیرایۂ بیان سمجھ لینے کے بعد
اس کا کوئی خطاب کسی کے لئے خاص نہیں ہوتا بلکہ سبھی کے لئے عام ہوتا ہے۔ صرف بات
کو زیادہ مضبوط کر کے دکھانے کے لئے کسی قوم کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے یا تمثیل کا رنگ
اختیار کر جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خطاب صرف بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ ہر زمانے کے لوگوں
سے ہے جن کی بنی اسرائیل جیسی حالت ہو گئی ہو۔ اچھائیوں اور برائیوں، خوبیوں اور خامیوں
میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ تبدیلی صرف فرد اور قوم میں ہوتی ہے۔ پہلے کسی قوم اور
فرد میں جو بات پائی جاتی تھی آج دوسری قوم اور فرد میں وہی بات پائی جاتی ہے۔ خطاب
کے پہلو ملاحظہ ہوں کہ وہ کس طرح ان لوگوں پر صادق آتے ہیں جن کو سرداری دی جاتی
ہے اور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور اس قوم و جماعت پر صادق آتے ہیں جس کو دوسری
قوموں اور جماعتوں کے مقابلہ میں سرداری ملتی ہے اور ان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

ے علم و فضل کی جو نعمت میں نے تمہیں دی ہے اور جس کی بدولت تمہیں دوسروں کے مقابلہ
میں بڑائی اور سرداری حاصل ہے اس کو یاد کرو اس کا شکر اور حق ادا کرو۔ دوسروں کے مقابلہ
میں انسانوں کو جس نعمت کی بدولت ہی بڑائی و سرداری حاصل ہوتی ہے وہ اس کا حق نہیں
ہوتا بلکہ اللہ کا انعام و احسان ہوتا ہے۔ یہ نعمت تنہا نہیں آتی ہے بلکہ بہت سی ذمہ داریوں
کو ساتھ لاتی ہے اور بہت سے ان کاموں کے مواقع فراہم کرتی ہے جو دوسروں کو نہیں
حاصل ہوتے ہیں۔ جب تک انسان اس نعمت کو اللہ کا انعام و احسان سمجھتا ہے اس کی
شکر گذاری میں گردن جھکی رہتی ہے اس کی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتا اور کام کے
جو مواقع میسر ہیں ان میں کمی و کوتاہی نہیں کرتا اور جب انسان نعمت کو اپنا حق سمجھنے

لگتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے نہ ذمہ داریوں کا خیال رکھتا ہے اور نہ کام کے مواقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بس اپنا حق اور فائدہ سامنے رہتا ہے۔ اس کی خاطر کتنا ہی کچھ اپنی جگہ سے ہٹنا پڑے اور اپنے کردار و اخلاق کا سودا کرنا پڑے۔

۲ے علم و فضل کی جو نعمت اللہ نے دی تھی یہ معاہدہ اسی سے متعلق تھا۔ علم و فضل ان کو دین و شریعت ہی کی راہ سے حاصل ہوا تھا اس بنا پر معاہدہ اصلاً دین و شریعت کے بارے میں تھا جو اللہ اور بندوں کے درمیان نہایت جامع معاہدہ ہوتا ہے۔

بندہ اللہ سے ٹھیک ٹھیک اس پر قائم رہنے اور زندگی میں اس کو رچانے و بسانے کا عہد کرتا ہے اور اللہ بندہ سے دنیا میں بڑائی و سرداری دینے اور آخرت میں فلاح و کامیابی کا عہد کرتا ہے۔ اس عہد کو پورا کرنے یا دین و شریعت پر قائم رہنے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہوتی ہے کہ کبھی فائدہ کو چھوڑنا پڑتا اور نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس لئے فرمایا کہ میرے عظمت و جلال کو سامنے رکھو اور مجھی سے ڈرو کہ میرے مقابلہ میں کسی دنیوی فائدہ کو اور نقصان کے اندیشہ کو نہ آنے دو۔

دین و شریعت کا تعلق زندگی کے کسی ایک گوشہ سے کبھی نہیں رہا اور نہ اس میں قدیم و جدید کی تقسیم رہی ہے کہ ہر قدیم شے دین ہو اور ہر جدید شے دنیا بن گئی ہو بلکہ دین و شریعت پر ٹھیک ٹھیک قائم رہنے کا مطلب ہی یہ رہا ہے کہ اللہ کا خلیفہ و نائب ہونے کی حیثیت سے ہر دور و زمانہ میں انسان پر جو ذمہ داریاں آتی ہیں خواہ ان کا تعلق ہماری اس زندگی سے ہو یا دوسری زندگی سے ہو ان کو پوری طرح انجام دیتے رہنا اسی پر اللہ کی طرف سے بڑائی و سرداری اور فلاح و کامیابی کا وعدہ ہوتا رہا اور اس کو پورا بھی کیا جاتا رہا ہے۔

ے اس معاہدہ (دین و شریعت) میں یہ بات بھی داخل تھی کہ بعد میں اللہ کی طرف سے جو کتاب آئے اور پہلے جو کتاب اللہ کی طرف سے آ چکی ہے اس کی تصدیق کرتی ہو تو اس پر ایمان لانا۔ وہ کتاب (قرآن) آ چکی ہے اور تمہارے پاس جو کتاب (تورات) موجود ہے اس کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ اب تم معاہدہ کے مطابق اس پر ایمان لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ توقع کے خلاف تم ہی پہلے اس کا انکار کر دو جبکہ دوسرے جن سے زیادہ توقع نہ تھی اور اس

کتاب سے کچھ واقف ہی نہ تھے وہ ایمان لا رہے ہیں۔

دین وشریعت کی ہمیشہ یہ خاصیت رہی ہے کہ اس کی بنیاد تصدیق پر قائم کی گئی ہے تکذیب (جھٹلانے پر) پر اس کی بنیاد نہیں رہی ہے جس کی بنا پر اس نے ہر دور و زمانہ میں پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق کی اور بعد میں اگر کوئی کتاب آنے والی تھی تو نہ صرف یہ کہ اسکی تصدیق کی بلکہ اس پر ایمان لانے کے لیے قول و قرار بھی لیا لیکن ماننے والوں کی یہ بدقسمتی بھی ہمیشہ رہی کہ انہوں نے بگاڑ کے زمانہ میں اپنی بنیاد تکذیب (جھٹلانے) پر رکھ لی اور ان کے نزدیک اپنے علاوہ سب کو جھوٹا قرار دینا دین وشریعت کی سب سے بڑی خدمت قرار پائی ھے یہ ان خرابیوں کی طرف اشارہ ہے جو بگاڑ کے زمانہ میں قوم یہود میں پیدا ہو گئی تھیں جس قوم میں بھی یہ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اس میں نہ کتاب کی صحیح تعلیم باقی رہتی ہے اور نہ اس پر ٹھیک عمل باقی رہتا ہے ــــ وہ یہ ہیں: (۱) دین بیچنا۔ یعنی دنیا کا معمولی فائدہ حاصل کرنے کے لیے دنیا کی سب باتوں کو نہ بتانا خاص طور سے ان باتوں کو حذف کر دینا جن سے آنے والے کتاب کی تصدیق ہوتی ہے یا جن سے زندگی میں ہمت وجرأت پیدا ہو جاتی ہے صرف ان باتوں کو بتانا جن سے اپنی سرداری وپیشوائی برقرار رہے اور عوام کے برگشتہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو یہ خرابی دین اور قوم دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ دین اصلی شکل میں باقی نہیں رہتا ہے اور قوم دین کے نام پر صرف رسمی اور رواجی کاموں کو کافی سمجھ لیتی ہے۔ اس خرابی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے کہ اللہ کے قہر وغضب سے ڈرا جائے جس کا حکم دیا گیا ہے "وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنَ" مجھی سے ڈرو یعنی میرے قہر وغضب سے بچو۔

"تھوڑی قیمت پر نہ بیچو" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ قیمت پر بیچنے کی اجازت ہے بلکہ گفتگو کا یہ انداز کام کی ذلت کو ظاہر کرتا ہے یعنی یہ کام کس قدر ذلیل ہے کہ جس کے مقابلہ میں پوری دنیا کوئی قیمت نہیں رکھتی ہے تم اپنے معمولی فائدہ کے لیے تھوڑی قیمت پر اس کو بیچ دیتے ہو۔

(۲) سچ میں جھوٹ ملانا یعنی دین وشریعت میں ان باتوں کو شامل کر دینا جو اس میں نہیں ہیں اور پھر ان کو اس طرح پیش کر دینا کہ اصل میں اور ان میں فرق نہ رہے۔ جیسا کہ یہودیوں نے اپنی بہت سی رایوں اور باتوں کو تورات میں شامل کر دیا تھا اور پتہ لگانا مشکل تھا کہ کتنا حصہ

اصلی ہے اور اللہ کی طرف سے آیا ہے اور کتنا حصہ نقلی ہے جو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ دین و شریعت کی حفاظت کا کام بہت مشکل ہے۔ ہر قوم نے اپنے بگاڑ کے زمانے میں سچ کے ساتھ جھوٹ ملا کر ہی حق کو باطل کے ساتھ گڈ مڈ کیا ہے۔ اس طرح نہ معلوم کتنی خرافات دین و شریعت کے نام پر رائج ہو گئیں اور کتنی بدعتیں اس کا حصہ بن گئیں پھر یہ عجیب ہے کہ ملاوٹ کے کام میں یکسانیت کبھی نہیں رہی کہیں کسی طرح یہ کام سرانجام پایا اور کہیں کسی طرح انجام پایا جس کی بنا پر بہت سے فرقے وجود میں آگئے اور قدم قدم پر ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے۔ دین و شریعت کے نام پر جو فرقے اور اختلافات نظر آ رہے ہیں ان میں بیشتر کا تعلق انہیں نقلی باتوں سے ہے اصلی باتوں میں فرقہ بندی و اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے۔

(۳) حق کو چھپانا۔ دنیوی فائدہ حاصل کرنے، دنیوی اقتدار برقرار رکھنے اور دنیوی آقا کو خوش کرنے کے لئے حق اور سچ بات کو چھپا لینا جیسا کہ تورات میں قرآن اور آخری پیغمبر کے بارے میں جو کچھ تھا یہودیوں نے اس کو چھپا لیا تھا کہیں اس کو بدل کر دوسری چیز پیش کر دی تھی اور کہیں اس کا دوسرا مطلب بیان کر دیا تھا۔ یہ کام چونکہ وہ جان بوجھ کر کرتے تھے اور ایسی حالت میں اس کی سنگینی بڑھ گئی تھی اس بنا پر فرمایا " وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ " (حالانکہ تم جانتے ہو) یعنی ایسا نہیں ہے کہ حقیقتِ حال کا تمہیں علم نہ ہو کہ جس کی وجہ سے عذر و معذرت کی کچھ گنجائش نکل سکے بلکہ علم کے باوجود تم ایسا کرتے ہو اور اتنے بڑے سنگین جرم سے باز نہیں آتے ہو۔

(۴) اللہ اور بندوں کے درمیان دین و شریعت پر قائم رہنے کا جو معاہدہ ہوتا ہے یہودیوں نے اس کی ابتدائی اور بنیادی باتوں کا بھی لحاظ نہ رکھا تھا چنانچہ نماز اور زکوٰۃ (اللہ کے بندوں پر خرچ کرنا) جن پر سب نبیوں کا اتفاق رہا اور سبھی نے زندگی کو سنبھالنے کے لئے ابتداء ہی سے ان کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے ان کو بھی پامال کر رکھا تھا۔ نماز یا تو بالکل ہی ختم کر دی تھی یا تنہا پڑھنے کی عادت ڈال لی تھی اور جماعت سے نماز پڑھنا تو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اسی طرح سود کے رواج پا جانے کے بعد زکوٰۃ دینے (اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے) کی بھی رغبت کم ہو گئی تھی اور جس قدر باقی تھی اس کا حق داران کے علماء اور جو نشستوں

نے اپنے کو بنا رکھا تھا۔ غربار اور مساکین جو اصلی حقدار تھے وہ محروم رہتے تھے۔
آیت میں نماز۔ زکوٰۃ (خرچ کرنا) اور جماعت تینوں کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے کہ اگر واقعی تمہیں دین و شریعت کا لحاظ و پاس ہے تو کم از کم ان باتوں کی طرف تو توجّہ کرو جو ہر اختلاف سے پاک ہیں اور جس طرح ہر شخص و قوم کو اپنی اپنی زندگی سنبھالنے کے لئے ان کی ابتدار میں ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح زندگی کو سنبھالے رکھنے کے لئے آخر تک ان کی ضرورت رہتی ہے۔ دینی و شرعی زندگی کی پہلی پہچان یہی ہیں اور انہیں سے ہوا کا رُخ دیکھا جاتا ہے۔

ے ذرا سوچو تو سہی! یہ بات کتنی قابلِ ملامت ہے کہ تم دوسروں کو تو نیکی و بھلائی کا حکم دیتے ہو اور خود اس سے دور رہتے ہو حالانکہ تم کتاب (تورات) پڑھتے پڑھاتے ہو جس سے اس فعل کی بُرائی تمہارے سامنے رہتی ہے کیا اتنی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے!

یہودی قوم کی ترقی و سربلندی دین و شریعت پر قائم تھی۔ علماء و دینی نمائندے اس ترقی و سربلندی کے محافظ و امین تھے۔ جب اس میں تنزّلی اور گراوٹ آئی تو پہلے علمار اور نمائندے اس کے شکار ہوئے پھر پوری قوم لپیٹ میں آگئی۔ یہی حال تمام ان قوموں اور جماعتوں کا ہوتا ہے جن کی ترقّی دین و شریعت پر قائم ہوتی ہے۔ ان میں تنزّلی اور گراوٹ اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہے۔ نیچے سے اوپر کی طرف نہیں جاتی —— اوپر سے نیچے کی طرف نہیں جاتی ہے۔ یعنی پہلے ان کے علمار اور نمائندوں کی حالت بگڑتی ہے۔ پھر پوری قوم و جماعت بگاڑ سے اپنے کو نہیں بچا پاتی ہے۔

ے بگاڑ اور خرابیوں کو بتانے کے بعد اب ان کو دور کرنے کی تدبیریں بیان کی جارہی ہیں وہ دو ہیں (۱) اپنی طبیعت پر قابو پانا اور (۲) اللہ سے تعلق و جوڑ پیدا کرنا۔ بری حالت سے اچھی حالت میں تبدیلی کے لئے طبیعت پر قابو پائے بغیر چارہ نہیں ہے اور ایسے موقع پر جس مدد و سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ سے تعلق و جوڑ کے بغیر نہ وہ مدد حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ سہارا ملتا ہے۔ پہلی تدبیر کے لئے لفظ صبر

اور دوسری کے لئے لفظ صلوٰۃ (نماز) لایا گیا ہے۔

(۱) صبر کو عام طور پر کمزوری دبے پن کے معنی میں سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کے اصل معنی مضبوطی، ثابت قدمی اور جمے رہنے کے ہیں جو طبیعت پر قابو پانے ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے صبر ایک زبردست قوت وہمت کا نام ہے جس کی حالت میں تبدیلی کے لئے شدید ضرورت ہوتی ہے اور جس پر ترقی وتنزلی کے آسمانی فیصلے موقوف ہوتے ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ جب کسی فرد یا قوم وجماعت کو اس کی پستی اور بگاڑ سے نکال کر ترقی اور اصلاح کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس کو نئی نئی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بہت سی پرانی چیزیں چھوڑنی پڑتی اور نئی چیزیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ بہت سے نئے تقاضے ہوتے ہیں جن کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں رہتا ہے اپنے فائدہ اور خواہش کو چھوڑنا پڑتا اور دوسروں کے فائدے اور ان کی خواہش کو دیکھنا پڑتا ہے۔ میدان میں مخالفین موجود ہوتے ہیں جن سے ہر موڑ پر ٹکراؤ ہوتا ہے۔ غرض اس طرح زندگی کا لمحہ لمحہ مضبوطی، ثابت قدمی مستقل مزاجی اور جماؤ کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے پورا کرنے ہی میں کامیابی ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں کامیابی کا مدار صبر کو بتایا گیا ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى	آپ کے پروردگار کا پسندیدہ فرمان
عَلٰى بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ	بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہو کر رہا اس
بِمَا صَبَرُوْا ؕ	وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا تھا۔

ایک جگہ پیشوائی وسرداری ملنے کا سبب صبر کو قرار دیا گیا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ	ہم نے بنی اسرائیل میں سے امام (سردار)
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا	بنائے تھے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں
(السجدہ آیت ۲۴)	کو ہدایت کرتے تھے یہ بلند مقام انہیں
	اس وقت ملا جبکہ انہوں نے صبر کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترقی واصلاح کی کوشش میں صبر کو امیر (کمانڈر) کا

لقب دیا ہے کہ اسی کی سرکردگی میں یہ میدان فتح ہوتا ہے :

الصبر امیر جنودہ — صبر مومن کے لشکر کا امیر (کمانڈر) ہے۔

(نوادر اصول)

لشکر کے اس کمانڈر (صبر) کی ضرورت ویسے تو ہر وقت رہتی ہے کہ اسی سے اندرونی حالت (ظرف) کا پتہ چلتا ہے کہ اس میں کتنا ظرف ہے؟ اور وہ کتنا دینے اور لینے کے لائق ہے لیکن ان تین وقتوں میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

(i) (۱) ذمہ داریاں پوری کرنے اور فرائض ادا کرنے کا وقت ہو۔

(ii) (۲) پسندیدہ چیزیں چھوڑنے اور فائدہ کی باتیں ترک کر دینے کا وقت ہو۔

(iii) (۳) پرانے کی جگہ نئے تقاضوں اور نئے مطالبوں کو قبول کرنے کا وقت ہو۔

(۲) نماز جس سے مدد لینے کا حکم دیا گیا ہے وہ اگرچہ ہماری زندگی میں بے اثر ہو گئی ہے جس کی بنا پر مدد لینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے لیکن اپنی حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ سے تعلق جوڑنے اس سے مدد حاصل کرنے کردار درست کرنے اور زندگی کو ایک مرکز کے تحت لانے میں نہایت مؤثر ہے۔

نماز قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ظاہری نہیں بلکہ باطنی لحاظ سے بھی ٹھیک ٹھیک ادائیگی ہو۔ دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جسم پر عاجزی و بےبسی کی کیفیت ہو اللہ کی عظمت و بڑائی سامنے ہو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ سے ملاقات ہوگی اور اس سے اعلیٰ زندگی حاصل ہوگی اور اس بات کا بھی یقین ہو کہ اللہ کے حضور حاضری دینی ہے۔ پھر زندگی میں نماز کے کیا کچھ اثرات نہ مرتّب ہونگے؟

دراصل یہی نماز انسان پر گراں گذرتی ہے اسی کو قائم کرنے اور اسی سے مدد لینے کا حکم دیا گیا۔ صرف ظاہری طور پر اس کو آراستہ و پیراستہ کر لینا اور دل میں تین سو ساٹھ بتوں کی انجمن سجاتے رہنا نہ نماز کو قائم کرنا ہے اور نہ اس کے مدد لینے کی بات سمجھ میں آتی ہے۔

دین و شریعت کی راہ سے اپنی ترقی و کامیابی کی جد و جہد میں صبر اور نماز سے مدد لینے کی بات نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ یہ دونوں بڑی روحانی قوتیں ہیں اور تجربہ کے

(باقی ص ۶۴ پر)